اوسط کے تصور کا فریب

جب ہم کہتے ہیں، "اس عمر میں بچے کو اتنا کچھ آنا چاہیے"، تو ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی آفاقی سچ بیان کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ کوئی خدائی فیصلہ نہیں بلکہ انسانوں کی بنائی ہوئی بات ہے یہ ایک اندازہ ہے جو بچوں کے ایک محدود گروہ کو دیکھ کر اور ایک ''اوسط'' نکال کر تیار کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ہم نے اس اوسط کو ایک معیار بنا لیا جس پر ہر بچے کو پورا اترنا چاہیے۔

اوسط کا دھوکہ

اگر کوئی بچہ اس اوسط سے پیچھے رہ جائے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اوسط سے نیچے ہے۔ اگر آگے نکل جائے تو اوسط سے بلند کہلاتا ہے۔ مگر خود اوسط کوئی مقدس معیار نہیں—یہ ایک عدد ہے، جو ایک محدود نمونے سے نکالا جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ نمونہ غیر متوازن ہو۔ یہ ''اوسط'' جس کی بنیاد پہ ہم ناپتے ہیں بچوں کی صلاحیتوں اور سیکھنے کے انداز کے تنوع کا پورا عکس بھی نہیں ہوتا۔

ہر بچہ منفرد ہے

ہمارے تعلیمی نقطہ ءِ نظر انفرادیت کی بات تو کرتے ہیں—کہ ہر بچہ اپنی رفتار، اپنے سیکھنے کے انداز اور اپنی صلاحیتوں کے ساتھ مختلف ہے۔ پرِ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم پھر بھی اُن کا موازنہ ایک شماریاتی اوسط کے معیار سے کرتے ہیں۔ عملاً یہ ایک کشمکش پیدا کرتا ہے— نظری طور پر ہم انفرادیت کی حمایت کرتے ہیں، مگر جانچ کے مرحلے میں اُسے کمزور کر دیتے ہیں۔

تصورِ اوسط کا پوشیدہ نقصان

لیبل جو مستقل چپک جاتے ہیں

مثال کے طور پر سات سال کا بچہ جو روانی سے نہیں پڑھ پاتا۔ چونکہ ''اوسط'' پڑھنے کی سطح پہلے ہی طے کر دی گئی ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ وہ پیچھے ہے۔ اساتذہ شاید اس بچے سے کم توقع رکھتے ہوں، ہم جماعت مذاق اڑاتے ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ بچہ سوچنے لگتا ہے، ''میں ذہین نہیں ہوں۔'' یہ لیبل اکثر اس کے اعتماد کو اس سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے جتنا شاید اصل میں نہ پڑھ سکنے کے مسئلے سے پہنچتا تھا۔

صلاحیت کی ناقدری

دوسری طرف، ایک دس سال کا بچہ جو عام بچوں سے پہلے ریاضی میں ضرب دینا سمجھ لے۔ چونکہ اسے ''اوسط سے اوپر'' سمجھا جاتا ہے، والدین اور اساتذہ مسلسل اس بچے سے اضافی کام، خصوصی توجہ اور مسلسل بہتر سے بہتر ہوتے رہنے کی توقعات رکھتے ہیں۔ اس دباؤ میں بچے کی کہانی سنانے، کھیل، یا فنون سے دلچسپی دب سکتی ہے۔

حقائق سے غفلت

ڈسلیکسیا کا شکار بچہ شاید کبھی "اوسط مطالعے کی رفتار" کے معیار پر پورا نہ اُتر سکے۔ تاہم، بہت سے ڈسلیکسیا کے شکار افراد غیر معمولی تخلیقی صلاحیت، مسئلہ حل کرنے کی قابلیت، اور بصری اندازِ فکر رکھتے ہیں۔ صرف اوسط پر توجہ دے کر اسکول ان صلاحیتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور صرف کمزوریوں پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔

زاویہ نظر میں تبدیلی

اگر ہم یہ سوال چھوڑ دیں کہ ''یہ بچہ اوسط کے مقابلے میں کہاں کھڑا ہے؟'' اور اس کے بجائے یہ پوچھیں:

- اس بچے کی منفرد صلاحیتیں کیا ہیں؟
- یہ بچہ کس رفتار سے قدرتی طور پر سیکھتا ہے؟
- کیسا ماحول اس بچے کو پھلنے پھولنے کے قابل بناتا ہے؟

مثال کے طور پر:

- وہ بچہ جس کی بول چال دیر میں بہتر ہو رہی ہے مگر ڈرائنگ میں ماہر ہے، اسے بول چال میں آگے بڑھنے کے سخت معیار کی بجائے کہانی سنانے کے لیے تصویروں کا سہارا دینا زیادہ فائدہ دے سکتا ہے۔
- وہ بچہ جو ریاضی میں دشواری محسوس کرتا ہے مگر چیزیں بنانے کا شوق رکھتا ہے، ممکن ہے عملی منصوبوں کے ذریعے تصورات کو مجرد ورک شیٹس کے مقابلے میں کہیں بہتر طور پر سیکھے۔

جب ہم تقابل ترک کر کے تجسس اور سمجھ بوجھ کو اپناتے ہیں، تو ہم حقیقی انفرادیت کی قدر کرتے ہیں اور بچوں کی حقیقی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں۔ بچے نمبر نہیں — مکمل انسان ہیں، جنہیں منفرد صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔

حاصل کلام

''اوسط بچے'' کا تصور ایک غلط فہمی ہے۔ کوئی خدائی قانون یہ نہیں کہتا کہ ''چھ سال کی عمر تک یہ سب ہونا ضروری ہے۔'' اصل بات یہ ہے کہ نشو و نما کے بے شمار راستے ہیں۔ اگر ہم اس انفرادیت کو پہچانیں اور اس کا احترام کریں، تو یہی ہماری نگہداشت میں موجود بچوں کے لیے ہمارا سب سے قیمتی تحفہ ہوگا۔